آغا خان مرحوم کے مذہبی تصورات

پروفیسر شیخ محمد عثمان

مسلمانوں میں مذہبی پیشوا اور فرقوں کے رہنما بھی بہت ہیں، اور مغربی تہذیب و معاشرت کے دلدادگان کی بھی کمی نہیں، لیکن ان میں ایسے لوگ کم نکلیں گے جنہوں نے اسلام اور تہذیب جدید دونوں کا مطالعہ تعصب و تنگ نظری سے بالاتر ہو کر صحت مند طریقہ سے کیا ہو اور دونوں کی حقیقت اور ان کا صحیح مقام پالیا ہو۔ آغا خان مرحوم کی حیثیت اس لحاظ سے غیر معمولی اور منفرد ہے۔ انہوں نے تعلیمی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کے ساتھ ساتھ اپنے سوانح حیات[1] اور بالخصوص اس کے آٹھویں باب میں جو افکار و تصورات پیش کئے ہیں وہ مذہب اور تہذیب جدید دونوں کے غائر مطالعہ کا نتیجہ ہیں اور اپنے قاری کو ایک خاص دعوتِ فکر و نظر دیتے ہیں۔ ان تصورات کی دلچسپی، صداقت اور افادیت کے پیش نظر میں اس مضمون میں اختصار کے ساتھ ان کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

مذہبی واردات

علامہ اقبال نے اپنے انگریزی خطبات میں "مذہبی تجربے" کی علمی و عملی حیثیت سے وضاحت کی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ دنیا کے تمام بڑے مذاہب' اسلام' عیسائیت، یہودیت، ہندو دھرم اور بدھ مت کی بنیاد ایک نہ ایک الہامی یا آسمانی کتاب پر ہے اور ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ یہ کتاب اُن کے پیغمبر نے بطور خود نہیں لکھی بلکہ یہ اس وحی یا الہام یا وجدان کا نتیجہ ہے جو اسے خالقِ کائنات سے اپنے باطنی رابطے کی بدولت حاصل ہوا۔ اعلیٰ سائنس اور بالخصوص فلسفہ کی نظر میں اس "باطنی رابطے" کا سوال جسے میں نے ذرا اوپر مذہبی تجربہ بھی کہا ہے، بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ عام طور پر جس علم کو ہم یقینی ماننے پر مجبور ہیں، وہ حواس خمسہ اور عقل و منطق کی بدولت

---

[1] MEMOIRS OF AGHA KHAN, LONDON, 1952

حاصل ہوتا ہے۔ ان ذرائع سے حاصل ہونے والے علم کو فلسفہ اور سائنس دونوں کی سند حاصل ہے۔ مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس علم کی کیا حیثیت ہے، جو نہ حواس کے ذریعے حاصل ہو اور نہ عقل و منطق کی بدولت بلکہ جس کو پانے والا یہ دعویٰ کرے کہ یہ اُس کے قلب کی ایک خاص واردات ہے۔ اور اسے یہ علم خالق کائنات سے براہ راست حاصل ہوا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے دنیا کے عظیم مفکرؔ اور فلسفی دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک وہ جو اس ذریعۂ علم کو غیر یقینی اور ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں اور دوسرے وہ جو اس کو قابل اعتماد، یقینی اور فطری جانتے ہیں۔

یہ کہنا بے محل نہ ہو گا کہ اس ذریعۂ علم کو حق بجانب اور سچا ثابت کرنا صرف مسلمانوں کا ہی معاملہ نہیں بلکہ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے، دنیا کے تمام بڑے مذاہب کا یہ مشترکہ مسئلہ ہے اور اس "جہاد" میں سبھی نے شرکت کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ گزشتہ نصف صدی میں خود سائنس اور فلسفہ کے حلقۂ تربیت سے بھی کچھ لوگ ایسے اُٹھے ہیں جنہوں نے اس "غیر سائنٹفک" ذریعۂ علم کو ایک صحیح اور درست بلکہ دوسرے ذرائع کے مقابلہ میں صحیح تر ذریعۂ علم ثابت کرنے میں مذہب والوں کا ہاتھ بٹایا ہے۔ مثال کے طور پر عصرِ حاضر کے ممتاز ترین سائنس دان آئن سٹائن کا یہ قول ملاحظہ ہو:۔

"انسانی زندگی کا سب سے گہرا اور اونچا تجربہ، باطنی تجربہ ہے۔ سچے علم کا یہی ایک سرچشمہ ہے۔ جو لوگ اس تجربے سے بے بہرہ ہیں اور اُن پر تحیر اور رعب خداوندی کا عالم کبھی طاری نہیں ہوا۔ انہیں روحانی طور پر مردہ سمجھنا چاہیئے۔" علامہ اقبالؒ نے اپنے پہلے اور دوسرے خطبے میں اس مسئلہ پر نہایت دقیق اور خالص فلسفیانہ رنگ میں بحث کی ہے۔ آغا خان نے بھی اپنی کتاب کے آٹھویں باب کا آغاز اسی مسئلہ سے کیا ہے اور مشہور مسلمان فلسفی ابن رشد کے حوالے سے بتایا ہے کہ علم کے ذرائع دو ہیں۔ ایک ذریعہ حواس کا ہے جن سے ہم مظاہرِ فطرت کو جانتے اور پہچانتے ہیں اور ان کی گنتی اور ناپ تول کرتے ہیں اور دوسرا ذریعہ وہ ہے جو ہمیں حقیقت تک فی الفور اور براہِ راست پہنچا دیتا ہے۔ مذہبی واردات اِسی ذریعہ سے تعلق رکھتی ہے۔

آغا خان مرحوم کا تصوّرِ محبت

کیا یہ ذریعۂ علم یا خود مذہبی تجربہ عقلی تجزیہ کا متحمل ہو سکتا ہے؟ اس سوال پر آغا خان نے براہ راست توجہ نہیں دی لیکن انھوں نے محبت کا جو نظریہ پیش کیا ہے، وہ دراصل ان کی طرف سے اور ان کے ہم خیال لوگوں کی طرف سے

اس سوال کا جواب ہے۔ عام لوگ اور خصوصاً فرائیڈ کی تحریروں سے متاثر حضرات جذبۂ محبت کو جنسی جذبہ سے الگ نہیں کر سکتے اور محبت کو ہوس ہی کی ایک ترقی یافتہ یا صیقل شدہ صورت قرار دیتے ہیں۔ آغاخان دنیا کے تمام دوسرے صوفیاء کی طرح محبّت کو جنس سے الگ اور جنس سے بہت بالا مقام دیتے ہیں اور مذہبی تجربے کی حقیقت کو محبّت کے تجربے کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک محبت وہ جذبہ ہے جس کے تحت انسان اپنی ذات اور نفس کے تمام سفلی تقاضوں کو بھول کر کسی دوسری ذات کے لئے وقف ہو جاتا ہے۔ یہ زندگی کا نہایت دقیع تجربہ ہے۔ آئے دن کے واقعات اور تاریخ کے شواہد یہ ثابت کے لئے کافی ہیں کہ اس جذبے کی سرشاری میں اور اس کی قدروقیمت کے سامنے شہنشاہ اپنے تخت و تاج کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ ایک انسان کو کسی دوسرے انسان کی چاہت میں جو سکون ملتا ہے، اس کے کردار کو جو بلندی نصیب ہوتی ہے اور اس کی روح کو جو بالیدگی اور کیف و سرور حاصل ہوتا ہے، اس کے مقابلے میں دنیا کی ساری دولت اور جاہ و اقتدار کی تمام شان و شوکت، ہیچ ہے اور یہ اس محبت کی کیفیت ہے جو ادنیٰ اور دنیاوی ہے! اس سے اندازہ کیجئے کہ اس اعلیٰ ترین محبّت کی کیفیت کیا ہوگی جو اپنے خالق کے ساتھ ایک انسان کو والہانہ طریق سے وابستہ کر دیتی ہے۔ محبّت الہٰی کا یہ جذبہ جب انسانی زندگی پر چھا جاتا ہے، تو اس کے قلب و نظر اور فکر و عمل کو ایک نئی اور انوکھی طاقت بخشتا ہے۔ مذہبی تجربہ اس شاخِ محبّت کا ثمر ہے۔ آغاخان مرحوم اس جذبۂ محبت کی تعریف میں لکھتے ہیں:۔

"جس طرح دولت و اقتدار کی لائی ہوئی خوشیاں انسانی محبّت کی مسرّتوں کے سامنے ہیچ ہیں، اسی طرح پاکیزہ ترین انسانی محبّت کی مسرتیں اس اعلیٰ روحانی محبّت کے سامنے ہیچ ہیں جو حقیقت کے براہِ راست ادراک و تجربہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ جذبۂ محبّت اور یہ روحانی تجربہ خداوندِ تعالیٰ کی عین بخشش و عنایت ہے۔ جس کے لئے ہمیں ہمیشہ دعا کرنی چاہیئے۔"

اس روحانی محبت اور مذہبی تجربہ کے باب میں دو باتیں آغاخان مرحوم نے اور بیان کی ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ نعمت مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کو بھی میسّر آتی رہی ہے اور آسکتی ہے اور دوئم یہ کہ بعض اشخاص دوسروں کے مقابلے میں فطرتاً اس نعمت اور تجربے کے زیادہ اہل ہوتے ہیں اور اگر وہ اپنی صلاحیتوں کی طرف مناسب توجہ دیں۔" خصوصاً مسلمان جن کا تصوّر توحید

انہیں حقیقت کے بہت قریب لے آتا ہے۔ تو بشرط فضل ایزدی ان کی روحانی طاقت بے اندازہ بڑھ سکتی ہے۔"

صوفیاء اور فقہاء

غور سے دیکھا جائے تو یہ وہ تصورات ہیں جو تھوڑے سے بہت اختلاف کے ساتھ مسلمان صوفیاء صدیوں سے پیش کرتے رہے ہیں۔ لیکن آغاخان مرحوم اور ان صوفیاء میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ہر بڑے مذہب اور نظام کی طرح اسلام کو بھی مختلف افراد اور مختلف جماعتوں نے اپنے اپنے ذوق اور ماحول کے مطابق مختلف طریق سے سمجھا ہے۔ صوفیاء کا نظریہ فقہاء سے اور فقہاء کا حکماء سے یوں الگ رہا ہے کہ صوفیائے نے فقط اسلام کے اس پہلو پر زور دیا جو خدا کی محبت اور روحانی تجربہ سے تعلق رکھتا ہے اور افراد اور معاشرے کی دیگر ضروریات کے متعلق اسلام کے جو احکام تھے ان کو یا تو نظر انداز کر دیا یا فروعی سمجھا۔ اس طرح فقہائے نے ان باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی جن کو صوفیاء زندگی اور موت کا سوال بنائے ہوئے تھے۔ اور مذہب کے قانونی اور معاشرتی پہلو ہی کو مرکز توجہ بنائے رکھا۔ حکماء نے عام طور سے روحانی اور معاشرتی دونوں پہلوؤں کی طرف سے اغماض برتا اور محض فکر و ذہن کے تقاضوں کی تکمیل میں لگے رہے۔

عصر حاضر کے صحت مند اثرات میں سے ایک اثر ہم پر یہ ہوا ہے کہ ہمارے دانش ور اور ارباب فکر اسلام اور اسلامی تعلیمات کی ہمہ گیری کو جاننے اور سمجھنے لگے اور یک رُخ خیالات کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ برّ صغیر پاک و ہند کی تاریخ میں اس خوشگوار تبدیلی کا آغاز سر سیّد سے ہوتا ہے۔ آغاخان مرحوم نے خود زندگی کے اس قدر مختلف اور متنوع پہلو دیکھے اور برتے تھے اور وہ زندگی کی ہمہ گیری اور اس کی ضروریات کی گوناگونی سے اس قدر باخبر تھے کہ وہ اسلام کو فقط ایک صوفی کی نظر سے نہ دیکھ سکتے تھے۔ لیکن اتنی بات مسلّم ہے کہ انہوں نے صوفیانہ نقطۂ نظر کو اپنی ترتیبِ افکار میں سب سے مقدم رکھا اور سب سے پہلے ذاتی مذہبی تجربے، روحانی واردات اور عشق الٰہی کو بیان کیا اور حق یہ ہے کہ اگرچہ مذہب اور خاص طور سے دینِ اسلام، معاشرتی نظام بھی ہے، اخلاقی ضابطہ بھی اور مابعد الطبیعی نظریہ بھی، لیکن اس کی روح ذاتی مذہبی واردات اور محبّت الٰہی میں پوشیدہ ہے۔

حیاتِ اجتماعیہ

متصوّفانہ تصوّرات کے بعد آغاخان مرحوم اسلام کے اجتماعی نظام کے ایک بنیادی خیال کو پیش کرتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو

حیثیتیں تھیں۔ آپؐ خدا کے رسول اور نبی تھے، جنہیں انسانوں کی رہبری اور اصلاح کے لئے مبعوث کیا گیا تھا۔ یہ آپؐ کی بنیادی حیثیت تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ بالخصوص ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کا اپنا ایک مخصوص معاشرہ قائم ہوگیا اور بعد میں حکومت بھی، تو رسولِ خدا صلعم سیاسی حکمران اور امور سلطنت کے نگران بھی تھے۔ آپؐ کی وفات پر جہاں تک آپؐ کی سیاسی اور دنیوی یعنی سیکولر حیثیت کا تعلق تھا، پہلے حضرت ابوبکرؓ کو اور پھر دیگر خلفائے راشدین کو آپؐ کا نائب اور خلیفہ تسلیم کیا گیا لیکن جہاں تک آپؐ کی نبوت کا تعلق تھا، وہ آپؐ کی وفات پر ختم ہوگئی۔ آپؐ آخری نبی تھے لہذا نبوت یا اس کی نیابت کے جاری رہنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہ بات اسلام اور مسلمانوں کے حق میں بے اندازہ خیر و برکت کا باعث ہوئی۔ اس کی بدولت اسلامی دنیا مذہبی پیشوائیت سے، جیسی کہ عیسائی مذہب (پاپائیت) اور دوسرے مذاہب میں عام طور سے پائی جاتی ہے، محفوظ ہوگئی۔ لیکن اس سے بھی بڑا فائدہ اس سے یہ ہوا کہ قرآن کی تفسیر و تعبیر کسی ایک فرد یا جماعت کا اجارہ نہ بن سکی۔ خود قرانِ حکیم کا اسلوب بیان ایسا ہے کہ وقت اور زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ جب زندگی کے تقاضے بدلتے ہیں، تو نئے علم اور نئے تقاضوں کی روشنی میں خداوندی ارشادات سے نئے معانی اور نئی تعبیریں انسانی فہم میں آتی ہیں اور ہمارے ذہن کو روشنی اور بصیرت بخشتی ہیں۔ اس طرح قرآن ہمیشہ کے لئے ہمارا رہنما ہے اور مسلمانوں میں جہاں تک اس کے معانی و مطالب کا تعلق ہے، وہ تنگ نظری اور تشدد پیدا نہیں ہوا جو بعض دوسرے مذاہب میں نظر آتا ہے۔

یہ خیال جسے آغاخان مرحوم نے امام غزالیؒ کے حوالے سے مختصراً بیان کیا ہے مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ شرع کی اصطلاح میں جسے اجتہاد کہتے ہیں۔ اس کا دروازہ دراصل اسی خیال کی بدولت کھلا رہا ہے۔ اجتہاد ہماری ترقی اور قوت کی ضمانت ہے۔ لیکن جو بات مجھے یہاں کہنی ہے وہ اس خیال سے متعلق کم اور آغاخان کی ذات سے متعلق زیادہ ہے۔ خود آغاخان مرحوم نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ یہ تصوّر مسلمانوں کی اکثریت یعنی اہل سنت والجماعت کا ہے۔ اگرچہ ایک دوسرے فرقے کا عقیدہ اس سے مختلف بلکہ برعکس ہے اور اس فرقے کے مسلمان رسول اکرمؐ کی دینی یا نبوی حیثیت کو بھی جاری سمجھتے ہیں۔ لیکن آغاخان مرحوم کی بے تعصبی اور حق پسندی دیکھئے کہ جب انھوں نے پہلے خیال کو درست اور عالمِ اسلام کے لئے مفید پایا تو

نہ صرف بے دریغ بیان کیا بلکہ اس طرح بیان کیا جو صرف ذاتی یقین کا نتیجہ ہی ہو سکتا ہے ۔

توحید اور رسالت آغاخان مرحوم نے اسلام کے تصوّرِ توحید اور رسول اکرمؐ کی بعثت کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ بنی اسرائیل کے تمام پیغمبر خدا کی طرف سے تھے اور اُن پر ایمان لانا ہر مسلمان کا فرض ہے ۔ اُن کی بدولت نسلِ انسانی کو جو روحانی فیضان حاصل ہوا ، اس سے انکار نہیں لیکن مرورِ ایّام سے بائبل کے تصوّرِ الٰہ نے ایک ایسی صورت اختیار کر لی جس کی صحت اور افادیّت دونوں میں کلام ہے ۔ یہودیوں کی تمام روحانی جدوجہد اور قوت کے باوجود ان کا خدا ایک قومی اور نسلی خدا بنا رہا اور اس کی ذات اپنے مظہرِ اعلیٰ یعنی کائنات سے الگ تھلگ ہی رہی ۔ ہندوستان اور چین اور دوسرے ممالک میں بھی توحید کا تصوّر دھندلا گیا تھا ۔ کہیں بُت پرستی مقبول ہو رہی تھی اور کہیں ہمہ اوست کے پردے میں کفر و شرک کے رجحان پرورش پا رہے تھے ۔ اسی طرح عیسائیت نے بھی اپنے پیغمبر کو انسان کے بجائے انسان کی صورت میں خدا مان لیا تھا ۔ ایسے وقت میں زندگی کا اہم ترین تقاضا تھا کہ توحید کا خالص اور صحیح تصوّر اہلِ دنیا کے سامنے لایا جائے ۔ اسلام نے رسول اکرمؐ کو ایک انسان کے طور پر پیش کیا ، جو اُس خدا کے رسول تھے ، جس نے کائنات کو صرف پیدا ہی نہیں کیا بلکہ جو اپنی قدرت اور مشیّت سے اس میں ہر دم ترقی و تغیّر کا سامان کر رہا ہے اور جس کی طرف توجہ دینے اور جس سے تعلق پیدا کرنے سے انسان حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتا ہے ۔ خدا کی ذات ہی زندگی اور قوت کا سرچشمہ ہے ۔ اس کے علاوہ باقی جو کچھ نظر آتا ہے ، سب کی حیات و بقا اُس کی ذاتِ اقدس پر منحصر ہے ۔ کائنات میں کوئی چیز ، کوئی ہستی خواہ وہ بظاہر کتنی ہی مہیب ، طاقتور یا مقدس نظر آئے ، اپنے ذاتی استحقاق کی بناء پر خدا سے بے نیاز اور آزاد ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی ۔ وہی سب کا سہارا اور سب کا آسرا ہے ۔

خُدا اور انسان خدا سے انسان یا کائنات کو کیا نسبت ہے ؟ اس کو مختلف لوگوں نے مختلف تمثیلوں سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے ۔ صوفیاء کی اکثریت انسان کو قطرہ اور خُدا کو بحرِ بیکراں بتاتی ہے ۔ اور یہ درس دیتی ہے کہ " عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا " ۔

مولانا رومؒ نے قطرہ اور دریا کی تمثیل میں خطرات دیکھ کر اپنے تصوّر کو آفتاب اور آئینہ سے ظاہر کیا ہے ۔ انسان آئینہ ہے اور خدا روشنی اور قوت کا بے پایاں سرچشمہ ہے ۔ جس طرح

شیشے کو آفتاب کے سامنے لانے سے اس میں آفتاب کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس سے شعائیں بھی پھوٹنے لگتی ہیں اور بعض شیشوں میں حرارت بھی آجاتی ہے۔ بس اسی طرح انسان قربِ الٰہی سے عکسِ الٰہی بن سکتا ہے۔ آغا خان مرحوم نے آفتاب اور حوض کی تمثیل پیش کی ہے۔ حوض میں آفتاب کا عکس ضرور آجاتا ہے اور شائد آنکھوں میں تھوڑی سی چکاچوند بھی پیدا ہو سکتی ہے لیکن یہ عکس اصل آفتاب کے سامنے انتہائی بے بضاعت اور حقیر ہے۔ خدا کی ذات دہکتا ہوا بے پایاں آفتاب ہے۔ اور کائنات اپنی تمام وسعتوں، قدامتوں اور قوتوں کے باوجود اس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی کہ حوض کے پانی میں ذاتِ اقدس کا ایک عکس ہے۔

اخلاقی اور سیاسی ضابطے

توحید کے اسی تصوّر سے آغا خان مرحوم اسلام کے اخلاقی ضابطوں کی طرف آتے ہیں اور اُن کے متعلق یہ خیالات ظاہر کرتے ہیں کہ خالق کائنات کو یوں جان لینے اور کائنات سے اس کا جو تعلق ہے اس کو سمجھ لینے کے بعد قدرتی طور پر انسان میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اسے وہ ضابطہ معلوم ہو جائے، جسے اختیار کر کے وہ خدا کا قرب اور زندگی میں اپنا صحیح مقام پا سکے۔ اس کے لئے اسلام نے پاکیزہ دنیا داری پر زور دیا ہے۔ جو شخص شادی نہیں کرتا، گھر بنانے اور باپ بننے کی ذمّہ داریوں سے بھاگتا ہے، اسلام اسے پسند نہیں کرتا۔ اسلام میں تارک الدنیا سادھوؤں، بیراگیوں اور چلہ کشوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ صحت مند انسانی جسم غفلت اور اذیّت کا نہیں بلکہ مناسب دیکھ بھال اور توجہ کا مستحق ہے۔ نماز جو انسانی شرر کو آفاقی شعلہ تک پہنچاتی ہے، روزانہ کی ضروریات میں سے ہے۔ اگر صحت بگڑ جانے کا اندیشہ نہ ہو تو سال بھر میں ایک معقول مدّت کے لئے روزہ بھی ضروری ہے۔ اس سے جسم و روح دونوں کی تربیّت مقصود ہے۔ بدکاری، شراب نوشی، غیبت اور ہمسائے کا بُرا چاہنا سختی کے ساتھ ممنوع ہے۔

اسلام میں رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہیں۔ کالے، گورے، بھورے، پیلے سب آدم کی اولاد ہیں اور ان میں نورِ خدا کی چنگاری موجود ہے۔ اور یہ دیکھنا ہر شخص کا فرض ہے کہ یہ چنگاری بجھنے نہ پائے بلکہ اس کی لَو بڑھ کر نورِ ازلی سے ہمکنار ہو۔ اس کام میں اور زندگی کے دوسرے کاموں میں تمام انسانوں کو خواہ وہ امیر ہوں یا غریب ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا چاہئے

اسلام کی برادری مساوات اور اخوت کی بنیاد پر استوار ہے۔

اس ضمن میں آغا خان مرحوم نے تقدیر کے اُلجھے ہوئے صدیوں پُرانے اور دقیق سوال پر صرف ایک فقرہ لکھا ہے۔ لیکن کچھ اس انداز سے لکھا ہے کہ مذہب و فلسفہ کا کوئی طالب علم اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا "مسلمان خدا کو عادلِ مطلق مانتا ہے اور اس بات کا قائل ہے کہ جبر و قدر کے عظیم مسئلے کا حل صرف اس سمجھوتے میں ہے کہ انسان جو کچھ کرنے والا ہے، اس کو خدا جانتا ہے۔ لیکن انسان اس بات میں آزاد ہے کہ وہ اسے کرے یا نہ کرے۔"

اسلام جنگ و قتال کو پسند نہیں کرتا وہ ساری دنیا میں امن دیکھنا چاہتا ہے۔ اسلام کے معنی ہی امن و سلامتی کے ہیں۔ خدا کی سلامتی انسانوں پر اور انسانوں کی سلامتی ایک دوسرے پر۔ اسلام میں سود حرام ہے لیکن آزاد اور دیانت دارانہ تجارت و زراعت کی ہر رنگ میں حوصلہ افزائی کی گئی ہے کیونکہ اس کے بغیر انسانی فلاح و ترقی کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ سیاسی اعتبار سے جمہوری طرز کی حکومت سب سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ جن مسلمان ملکوں میں مطلق العنان بادشاہت کارفرما رہی ہے، وہاں ایک بادشاہ کے مرنے پر دوسرے کا انتخاب سوائے طاقت کے اور کسی اصول پر طے نہیں پایا اور یہ خطرناک طرزِ عمل ہے۔

اسلام انسان کے علاوہ دوسری مخلوقات میں بھی میں روح کی موجودگی کو تسلیم کرتا ہے اور اس لحاظ سے بعض دوسرے مذاہب سے آگے ہے۔ وہ حیوانات، نباتات، حتیٰ کہ جمادات اور مکان و فضا کی زندگی کا بھی قائل ہے۔ البتہ انسان کو ان سب پر فوقیت دیتا ہے۔ کیونکہ اس کی روح ان سب سے ترقی یافتہ اور غیر معمولی ممکنات کی حامل ہے۔ اسلام فرشتوں کا قائل ہے۔ یہ وُہ عظیم روحیں ہیں جو روحانیت کے بلند مقام پر فائز ہیں اور ان قوتوں کے مرکز ہیں جو ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں، عیسائیت کی حد تک گئے بغیر اسلام شیطانی رُوحوں کی موجودگی کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ یہ روحیں اپنی مخفی اکساہٹوں اور وسوسوں سے ہمیں نیکی کے اُس سیدھے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہیں، جو حضرت ابراہیمؑ، حضرت عیسٰیؑ، سیدنا محمدؐ اور دوسرے لاکھوں برگزیدہ انبیاء و مرسلین کا راستہ ہے اور جس پر چل کر چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے انسان کو حقیقی کامرانی نصیب ہوتی ہے۔

مختصراً یہ ہے، وہ تصوّرِ اسلام جسے فرقوں کے باہمی اختلافات سے قطع کرکے آغاخاں مرحوم نے اپنی خود نوشت سوانح کے آٹھویں باب میں پیش کیا ہے۔ کتاب کے بعض دوسرے مقامات سے بھی مذہب کے متعلق ان کے تصوّر پر روشنی پڑتی ہے۔

بے تعصبی اور فراخ دلی

صدیوں کے جمود اور جہالت نے مسلمانوں کو تنگ نظر اور اوہام پرست بنادیا ہے اور آج ہماری اکثریت اپنی تمام کوتاہیوں اور بداعمالیوں کے باوجود اپنے آپ کو خدا نیکی اور بہشت کی اجارہ دار سمجھتی ہے لیکن قرآن کی تعلیمات، قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا طرزِ عمل اور ہمارے بہترین دماغوں کا فیصلہ ہمیشہ اس رجحان کی مخالفت کرتا رہا ہے۔ قرآنِ حکیم نے نیک دل یہودیوں اور عیسائیوں کی بڑی فراخدلی سے تعریف کی ہے۔ رسول اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ اہلِ کتاب سے، ان میں سے بعض کی شرانگیزیوں کے باوجود، بڑی کشادہ دلی اور مروت کا سلوک فرماتے رہے۔ اس کے بعد حالات نے ایسا رخ بدلا اور تاریخ میں ایسے موڑ آئے (یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے تعصب کا قدرتی ردّعمل بھی اس کا ایک اہم سبب ہے) کہ مسلمانوں نے بھی خُدا اور بہشت کو اپنی اجارہ داری بنالیا جس طرح دوسرے مذاہب ان کو بنائے ہوئے تھے۔ آغاخان مرحوم کا طرزِ عمل اس تنگ نظری اور غلط روی کے خلاف ایک کامیاب جہاد تھا، جس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

آغاخان مرحوم کی ابتدائی تعلیم و تربیت چار اُستادوں کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ تین عیسائی تھے جن سے انھوں نے انگریزی اور فرانسیسی زبانیں اور سائنس، تاریخ او سیاسیات کے علوم سیکھے۔ چوتھے استاد ایک مذہبی عالم تھے جنہوں نے آغاخان مرحوم کو عربی، فارسی اور دینیات کا درس دیا۔ آغاخان مرحوم نے اپنے چاروں اساتذہ کا ذکر کیا ہے اور ان کے بارے میں اپنے تاثّرات قلم بند کئے ہیں۔ تینوں عیسائی اُستادوں کی وہ بہت تعریف کرتے ہیں جنہوں نے اپنے شاگرد کو وسیع النظر، فراخدل اور علم دوست بننے میں مدد دی اور ان کے لئے وہ سراپا سپاس ہیں۔ لیکن اپنے چوتھے استاد کے لئے جو اپنے علم و فضل کے باوجود ایک تنگ نظر ملّا تھے، اُن کے پاس کوئی کلمۂ تحسین نہیں۔ اس کی روئداد خود اُن کے الفاظ میں سنیئے:

ان (تین عیسائی اساتذہ) کے لئے میرے پاس سوائے تعریف کے اور کچھ نہیں لیکن افسوس

ہے کہ اس شخص کے لئے جو میری عربی، فارسی اور اسلامیات کی تعلیم پر مامور تھا، میرے پاس کوئی کلمۂ خیر نہیں۔ وہ نہایت پڑھا لکھا، بڑا ہی عالم فاضل اور عربی ادب اور اسلامی تاریخ کا ماہر تھا۔ لیکن اس کے علم و فضل نے نہ اس کے ذہن کو وسعت دی تھی اور نہ دل کو گرمی و حرارت بخشی تھی۔ وہ ایک متعصّب فرقہ پرست تھا۔ اور وسیع مطالعے کے باوصف اُس کا دماغ اس قدر تاریک اور تنگ تھا کہ اس سے تاریک تر اور محدود تر دماغ میں نے زندگی بھر اور کہیں نہیں پایا۔ اگر اسلام وہی چیز ہوتا جو وہ بتاتا اور پڑھاتا تھا تو یقیناً خدا نے رسول اکرمؐ کو عالمِ انسانی کے لئے رحمت بنا کر نہیں بلکہ (نعوذ باللہ) عذاب بنا کر بھیجا ہوتا۔ اُس کے درس کو سننا بڑا تکلیف دہ اور ایک لحاظ سے کرب انگیز تھا۔ اس سے سننے والا اس نتیجہ پر پہنچتا تھا کہ خدا نے انسانوں کو فقط اس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے کہ انہیں جہنم کی آگ میں جلایا جائے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اس کا علم گہرا اور وسیع تھا لیکن وہ سب کا سب تلخی اور نفرت میں ڈھل چکا تھا۔ چند سال کے بعد وہ طہران واپس چلا گیا۔ جہاں اس کی شہرت اسلامیات کے مُعلّم کی حیثیت سے دُور دُور تک پھیل گئی اور وہ ایران کے ممتاز ترین علماء میں شمار ہونے لگا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ آخری دَم تک وہی متعصب مُلّا ہی رہا ہوگا، جس سے مجھے سابقہ پڑا تھا۔"

موجودہ زمانے میں جب کہ بعض مذہبی افراد اداروں نے رواداری، روشن خیالی اور ترقی کی راہیں روک رکھی ہیں۔ آغا خان مرحوم کے افکار و خیالات کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔